ہوگی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائیگا۔ اقتصادی کشمکش ایک لامتناہی فقیہانہ بحث کی صورت اختیار کر لیگی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جوں کے توں دھرے کے دھرے رہ جائینگے۔

م:۔ جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ در اصل پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اس روح سے اور انصاف کے ان اصولوں سے محروم ہو گیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان کے اندر اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا، وہی بدقسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو پھاڑنے اور باہم ٹکرا دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کشاکش کے ہولناک نتائج بھگت چکے ہیں اور اس سے لگے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو ان اجتماعی فلسفوں کے حوالہ کر دیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ ——— طبقاتی جنگ ——— برپا کر دیں اور ہمیں اس وقت تک امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیامیٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لئے قبول کر لیا کہ ان کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خود غرضیوں کے نشو و نما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظام حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے ان لوگوں کو ابھاریں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالا تر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی تلاش پوری قوم کو بحیثیت مجموعی کرنی چاہیئے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں ان کے انتخاب میں صرف اس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ بھروسے کے قابل سیرت رکھتے ہوں اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

۳:- میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں بصرف خلوص اور ایمانداری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیئے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیئے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گتھیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالہ کر دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی صحیح فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کے لئے فقیہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجربے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دینیات کے ماہرین کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۴- آپ جب "دینیات" کا لفظ بولتے ہیں تو شاید "دنیویات" کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔ اسی لئے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ان ماہرین دینیات کے حوالہ کر دیا جو دنیویات سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن، اپنی سیاست اور اپنی معیشت کے مسائل ان ماہرین کے حوالہ کئے جو صرف مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرین دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں، یعنی گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشاکش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم اپنی قوم میں ایسے لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کر ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری قومی زندگی کو سارے جہاں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دے؟

۳:- ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کا موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اور مشکل پیش آئیگی۔ ہم لبا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور اُن کی لفظی حیثیت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سود ہی کو لیجیے۔ سود کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ اقتصادی استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن جائز تجارت کو روا رکھا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں سرمایہ داری نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علماء جب اقتصادیات پر فتوے لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں مہاجنی سود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بدحالی اُس شے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، یعنی صنعتی سرمایہ داری اور بینکنگ۔

۴:- یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں ہر اُس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس کی روح کو چھوڑ کر صرف اُس کے الفاظ لے لئے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی علم اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون کی روح سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں مگر ظاہرداری کو قائم رکھنے کے لئے قانون کی شکل بدلنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا ارادہ موجود ہو۔ یہ چیز جب موجود ہوگی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لئے اپنے اندر سے اُنہی لوگوں کو منتخب کریں گے، جو قرآن و سنت کے محض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ اُن کی روح کو بھی سمجھتے ہوں۔

۵:- شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہً مذہبی اختلافات

بارے میں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقبل کے سیاسی اور مذہبی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

ج:۔ ان اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے اور انہیں بھی ہم اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اس نقطۂ نظر کے مطابق چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو، اور قلیل التعداد گروہوں کے نقطۂ نظر کی زیادہ سے زیادہ رعایت کی جائے جس کی اصول میں گنجائش ہو، نیز اقلیت کی حیثیت سے ان کے حقوق کا منصفانہ تحفظ کیا جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان کی ریاست اسلام کے ان وسیع ترین اصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو ان وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ ورنہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہو گی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لئے اتفاق کر لیں کہ اسلام پر اتفاق نہ ہو سکے۔

س:۔ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ آپ کس طرح ان کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کر لیں اور اس کے وفادار رہیں؟

ج:۔ اس گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک انہی اصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اس کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے حقوق شہریت اور اس کے مذہب، کلچر اور پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے، یقین دلا دیا جائے کہ اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔ وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اس کی خاطر اپنی رائے بدل دے

اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے
باشندوں کی فلاح ہے۔ اس کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ ملک کا نظام اس کی اس رائے کے مطابق ہو۔
اقلیت اس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے۔ مگر یہ کہنے کا اسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے
بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ رہا رواداری کا سوال، تو حقیقت یہ ہے کہ رواداری
کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس انصاف، شرافت اور
پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جائے۔ آپ اقلیت کو محض اس ریاکاری سے مطمئن
نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنا لی۔ اقلیت
یہ دیکھے گی کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا
رواداری اور فیاضی پر۔ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے
یا بیزار بن کر۔

(۱۰) س: میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات، معاشرت
اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔
اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست
افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی۔ وہ اس انداز فکر اور فلسفۂ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں
میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں
میں صحیح اسلامی سیرت پیدا کریں اور انہیں دین کی اصل اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار ہمارے دلوں میں
جاگزیں ہو جائیں گی، ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے۔ اس وقت ہمارا سیاسی نظام
خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب
تک ہماری روحانی، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری رائے
میں وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لئے اسلامی ریاست
کو قائم کرنے کی تمام کوششیں قبل از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت

گھڑی کر سکیں۔

۴:۔ آپ نے یہ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پرزور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو۔ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں۔ ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا۔ اس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے، بلکہ درحقیقت اس وقت ریاست کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچے لئے جا رہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالات میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لیگی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے؟ یا وہ طرز عمل اختیار کریگی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے؟ یا اب بھی وہی پچھلی صورت حال برقرار رہیگی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیر تشکیل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں یہ ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائیگا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائیگا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائیگی۔

# رسائل و مسائل!

## حلفِ وفاداری

مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے قواعد ملازمت میں جو تازہ ترمیم کی ہے اس کی رُو سے ہر سرکاری ملازم کو خواہ وہ پہلے سے ملازم ہو یا اب ملازمت میں داخل ہو، حسبِ ذیل حلف اٹھانا پڑے گا:۔

"میں خوب سوچ سمجھ کر یہ قسم کھاتا ہوں (یا اقرار کرتا ہوں) کہ میں پاکستان کے دستور حکومت کا جیسا کہ وہ از روئے قانون قائم ہے سچّے دل سے وفادار اور مخلص ہوں گا اور یہ کہ میں اپنی قابلیت، علم اور سلیقے کے مطابق زیادہ سے زیادہ اخلاص اور دیانت کے ساتھ اپنے منصب کے فرائض انجام دوں گا۔"

اس حلف کے پہلے جزء سے سرکاری ملازموں کا ایک کثیر طبقہ غیر مطمئن ہے اور اُنہیں یہ شبہ ہے کہ آیا ایک مسلمان ایمانداری کے ساتھ موجودہ غیر اسلامی دستور کی وفاداری کا حلف اُٹھا سکتا ہے؟ براہِ کرم اس معاملہ میں ہماری رہنمائی فرمائیے۔

اس مضمون کے سوالات متعدد جگہوں سے ہمارے پاس آئے ہیں۔ انفرادی طور پر ہر ایک کو الگ جواب دینا مشکل ہے۔ لہٰذا اِن صفحات میں سب کو ایک جامع جواب دیا جاتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی سرکاری ملازم یا ملازمت کا اُمیدوار یہ حلف لے یا نہ لے ہمارا کام نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ تو ہر اس شخص کو خود ہی کرنا چاہئے جس کے سامنے یہ سوال فیصلہ طلب ہو اور اپنے ضمیر سے پُوچھے کہ آیا اس حلف نامے کے ساتھ اسے ملازمت قبول ہے یا نہیں۔ ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف موجودہ دستور اور اُس کے حلفِ وفاداری کی اصولی حیثیت واضح کرنے کی حد تک ہی ممکن ہے۔

موجودہ دستور کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر مبنی ہے۔ اصولاً یہ ایک بے دین